نطشے کے قول پر مبنی ہے۔

" نطشے کا ایک قول ہے جو نہ جانے اس نے سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے یا ازرہ مزاح اور وہ یہ ہے کہ انسان کی حیثیت بندر اور فوق البشر کے مابین پُل کی سی ہے۔ ۔ ۔ ۔ یہ قول متین ہو خواہ تمسخر ہو بہر صورت وہ پُل جو بندر کو فوق البشر میں منتقل کر دے، موجود نہیں، نہ ہو سکتا ہے۔ اس پُل کو نہ بندر تعمیر کرتا ہے نہ فوق البشر، اور نہ خود انسان اور نہ دست فطرت، اس لیے کہ فطرت تو (بقول نطشے) کبھی بلندیوں سے پستیوں کی طرف چل پڑتی ہے، اور کبھی پستیوں سے بلندیوں کا رُخ کر لیتی ہے، کوئی مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔ ہاں جو کہنا مُراد ہے وہ یہ ہے کہ انسان زمین سے آسمان تک ایک پُل کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس پُل کو تعمیر کرنے والا خدا ہے۔ اس پُل کی نیو اسفل السافلین ہے اور چوٹی اعلیٰ علیین — مٹی سے برآمد ہونے والا آدمی جس کی جبلت میں ہے کہ رُوحانی اور عقلی آفاق کی جانب چڑھتا جائے حسبِ ارشادِ ربانی یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (اے انسان تُو تو اللہ کی سمت محنت اور مشقت اُٹھاتا چلا جائے گا اور پھر اس سے جا ملے گا) وہ ضرور اللہ تک جا پہنچے گا، اس لیے کہ وہ حدیثِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق خالق کی صورت میں تخلیق کیا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس کی صورت سے مراد جسدی صورت نہیں بلکہ صفات کے باب میں ہم صورت ہونا ہے — اور وہ صفات ہیں رحمت، کرم، علم، عمل، مشیئت، مجد، عظمت، فتح، ابداع، انشاء (خلاقی) وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ تمام اوصاف جن کا انسان سے مطالبہ کیا گیا انسان ان کو اپنانے پر بخوبی قادر ہے[1]

---

[1] حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ (بیروت، دار الکتاب العربی) ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

© rasailojaraid.co

اور یہ انسان کو پستیوں سے بلندیوں کی طرف لے جانے والا قرآن جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی وہ رسّی قرار دیا ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے ۔ ” کِتَابُ اللّٰہِ ھُوَ الْحَبْلُ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ “ یہی وہ رشتہ ہے جس سے محروم ہو کر انسان انسان نہیں رہتا اور اسفل السافلین میں جا گرتا ہے، اسی لیے تو حضرت علامہ نے فرمایا تھا ؎

ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست !
اعتصامش کن کہ حبلُ اللہ اوست
چوں گہر در رشتۂ اُو سُفتہ شو !
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو !

(ہم سراپا مٹی ہیں اور قرآن دل ہے ۔ دل بھی آگاہ ، لہٰذا قرآن کو مضبوطی سے پکڑ لے یہی اللہ کی رسّی ہے ، تو گویا تو اپنے آپ کو قرآن کے رشتے میں موتی کی طرح پرو لے یا پھر ذرّۂ خاک کی طرح تتر بتر ہو جا)

— قرآن کو دل آگاہ قرار دینا توجّہ طلب امر ہے ۔

آخر انسان کیوں بار بار گرتا ہے، اس باب میں انسان کو متنبہ کرنے کے لیے قرآن کریم زور دے کر کہتا ہے کہ ان اقوام کے عروج و زوال کا مطالعہ کرو جو تم سے پہلے ہو گزری تھیں ۔ وہ قومیں تم سے زیادہ طاقتور تھیں اور آج ان کے آثار کبریائی میں سے محض دھندلے نقوش باقی ہیں تا کہ اولادِ آدم عبرت حاصل کرے ، ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا کہ قوموں کے زوال کا سبب یہ نہیں کہ اللہ ایک خاص مدّت تک نعمت دے چکنے کے بعد اُن سے یونہی شوقاً اور شغلاً توجہ ہٹا لیتا ہے اور پھر اسی طرح شوقاً اور شغلاً کسی دوسری قوم کو نوازنے لگتا ہے ۔ یہ بات نہیں ، حق یہ ہے کہ انسان خود غافل ہو جاتا ہے ۔ فکر و عمل کی دیانت سے اپنے آپ کو معرّیٰ کر لیتا ہے ، دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے لگتا ہے ، نیت میں خلل راہ پا لیتا ہے ۔ اور اس کی پوری شخصیت کا رویّہ انسانی رویّے کے بجائے بہیمی اور حیوانی رویّہ بننے لگتا ہے ۔ چنانچہ اس تدریجی ، اور اندرونی زوال کے باعث اس میں قدرت و قوت کی کمی نمودار ہوتی چلی جاتی ہے ۔ لہٰذا اس کا رزق ، اس کی فارغ البالی ، اس کی آزادی اور اس کی شان رفتہ رفتہ رفت گذشت

© rasailojaraid.co

ہو جاتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے :

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۔

(سورۃ انفال، آیت ۵۳)

" اور یہ (کسب زوال وعتاب) یوں ہے کہ اللہ تو کسی بھی نعمت کو جو وہ کسی پر ارزانی کر چکا ہو نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود اسے نہ بدل ڈالیں جو کچھ ان کے اندر ہے۔ یعنی جب تک وہ اپنی خصلت وسیرت خود نہ بگاڑ لیں۔"

مراد یہ ہے کہ انہوں نے حصولِ نعمت کے لیے اپنے اندر جو قابلیت پیدا کی تھی جب اس قابلیت ہی کو باقی نہ رکھا تو نعمت کیسے رہتی؟ ــــ حضرتِ علامہ اقبال مطالعۂ دولت اور مشاہدہ کا رخانۂ فطرت کے بعد از روئے قرآن تیسرا مصدرِ علم و آگہی تاریخ کو قرار دیتے ہیں اور تاریخ کی عطا کردہ بصیرت یہ قرار دیتے ہیں کہ قومیں اپنی اجتماعی غلط کاریوں کی سزا پاتی ہیں۔[1]

انفرادی سزا تو ہے ہی، اس سے مفر کیوں، وہ تو واضح حکم ہے کہ ہر ایک کو اللہ کے حضور میں آ کے اپنا نامۂ اعمال پڑھنا ہوگا، اس وقت حقائق کھل کر سامنے آجائیں گے۔ اللہ کی طرف سے فہمائش کے طور پر ارشاد ہوگا "آج تو تیری نظر بڑی تیز ہے"۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ " (سورۃ ۵۰، آیت ۲۲)

(جاری ہے)

❀❀❀❀❀

بقیہ: ادراکِ حقائق میں عقل کی واماندگی

کئے ہوئے علوم کو قبول کرنا ہے تو ایسی حالت میں اس کے لئے نہایت ہی مناسب تھا کہ وہ بجائے قوتِ فکریہ وغیرہ اپنے خدام کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے اور ان کے عطایا قبول کرنے کے اپنے آقا ربّ العزّت کے روبرو ہاتھ پھیلاتی اور ان کی بخششوں کو لے کر سر آنکھوں پر رکھتی۔"

© rasailojaraid.com

دورِ حاضر میں مذہبی واردات کا مسئلہ

ازقلم : چوہدری مظفر حسین

قرآن حکیم کے مطالعہ میں اگر نقطہ نظر یہ ہو کہ ہمیں ان غیبی اور مابعد الطبیعاتی حقائق کا علم حاصل ہو جائے گا جن پر ایمان لانا ہمارے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے تو اس سلسلے میں خود قرآن حکیم ہمیں متنبہ کر دیتا ہے کہ انسان کو جو علم عطا کیا گیا ہے وہ قلیل ہے۔ پھر جتنا علم اسے عطا کیا گیا ہے وہ یا تو متشابہات کے ضمن میں آتا ہے یا ذہن کے زمرے میں آتا ہے اور اس سے انسان کی وہ آرزو پوری نہیں ہوتی جس کی اس کے حواس کو جستجو ہے۔ یہود نے ایمان لانے کے لئے خدا کو عیاناً دیکھنے کی گستاخانہ شرط پیش کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے قراریٔ محبت سے مجبور ہو کر ربِ ارنی کی درخواست کی لیکن دونوں صورتوں میں باری تعالیٰ کا جواب نفی میں تھا۔ ذاتِ خداوندی کے بارے میں حسی یا مشاہداتی علم کی نفی کے ساتھ ہی ساتھ قرآن ہمیں یہ کہہ کر خبردار کرتا ہے کہ خدا کے لئے اپنے ذہن سے مثالیں نہ تراشو۔ کیونکہ انسان کے ذہن میں آنے والی کوئی بھی شے اس کی مثل نہیں ہو سکتی۔ معرفتِ الہٰیہ کے ضمن میں قرآن حکیم کا یہ ارشاد ہے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائیں اور اتنے ہی سمندر ان میں مزید آ شامل ہوں تو بھی اللہ تعالیٰ کی باتیں لکھی نہ جا سکیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بزبانِ عجز فرمایا : ما عرفناک حق معرفتک

البتہ جو بات قرآن حکیم میں بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ مذکور ہے اور جسے سمجھنے میں انسان کو قطعاً کوئی دشواری نہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں کس قسم کے انسان کی تلاش ہے۔ اس لحاظ سے قرآن حکیم کا حقیقی موضوع تلاشِ آدم ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم ہمیں اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں متوجہ کرتا ہے :

© rasailojaraid.com

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتَابًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

اور اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں :

قدم در جستجوئے آدمے زن! خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

قرآن حکیم نے اپنے مطالعے کے سلسلے میں اسی نقطۂ نظر کو اپنانے کے لئے ایک عجیب و غریب تربیتی اسلوب اختیار کیا ہے۔ سورۂ فاتحہ قرآن کی سب سے پہلی سورہ ہے۔ شروع ہی خدا کی حمد و ثنا سے ہوتی ہے۔ گویا خدا پر ایمان ایک پہلے سے ہی تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ بعد میں عبادت و استعانت کے تمام رشتے اسی سے وابستہ کرتے ہوئے دعا کی شکل میں یہ بات انسان کے ذہن نشین کرا دی ہے کہ وہ جب بھی قرآن حکیم سے رجوع کرے طلبگارِ ہدایت کے نقطۂ نظر سے کرے اور اس کے متصلاً بعد اگلی سورہ میں قرآن مجید قاری کو یقین دلاتا ہے کہ ہاں یہی وہ کتاب ہے جو بلاشک و شبہ متقی لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔ لفظ ہدایت کے مفہوم میں منزل، راہِ منزل اور تدبیرِ منزل تینوں شامل ہیں۔ پھر ایک دوسرے مقام پر قرآن حکیم انسان کی منزل کا تعین ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس اس حال میں پہنچے کہ وہ خدا سے راضی ہو اور خدا اس سے راضی!

قرآن حکیم میں خدا اور بندے کے تعلق کو بیان کرنے کے ضمن میں "قُرب" اور "بُعد" کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ عربی لسانیات کے ایک سکالر محمد افتخار الدین دامتق "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ "ہم صرف تیری ہی نزدیکی چاہتے ہیں اور تیرے ہی ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے "عبد" کا ترجمہ "پہنچ"، عابد "پہنچنے والا"، معبود "جس تک پہنچا جائے"، عبادت "پہنچ کی صورت"، معبد "پہنچنے کی جگہ"، عبید "جو پہنچ چکا ہو"، اور عباد "پہنچنے کے عمل" سے کیا ہے۔ میں اس پوزیشن میں نہیں کہ اس ماہر لسانیات کی تحقیق کے بارے میں کچھ عرض کر سکوں۔ لیکن اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو خدا اور بندے کے درمیان محبت کا رشتہ ناگزیر ہے اور کم از کم ایک مقام پر تو قرآن حکیم بھی ایمان کو خدا اور بندے کے درمیان رشتۂ محبت سے تعبیر کرتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ

© rasailojaraid.com

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معرفت خداوندی کے بارے میں اعتراف عجز کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"میری دلی آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں، قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں............

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی جسے دیکھنا تو درکنار جس کی معرفت کا حق ادا ہونا بھی محال ہے، اس کے ساتھ رشتۂ محبت استوار ہو تو کیونکر ہو!

یہی وہ سوال ہے جو مذہبی واردات کے مسئلہ کو جنم دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اگر جوہر محبت سے خالی ہو تو عمل میں اخلاص ممکن نہیں اور دیکھا جائے تو صبر اور شکر محبت ہی کی کیفیات ہیں اور ایمان کی زندگی تو ہے ہی سراسر "خیال و نظر کی مجذوبی" سے عبارت۔ بقول علامہ اقبال:

اک شرع مسلمانی، اک جذب مسلمانی !!
ہے جذب مسلمانی سرِ فلک الافلاک
بے جذب مسلمانی اسے رہبر فرزانہ
نے راہِ عمل پیدا نے شاخ یقیں نمناک

دورِ حاضر کے مسلمان کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ وہ اپنے ایمان کو کس طرح محبت کی حرارت سے گرما کر ناقابلِ شکست یقین میں تبدیل کرے۔ ایک زمانے میں صوفیاء نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے کر اسلام کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ لیکن مرورِ زمانہ سے تصوف پر بھی انحطاط آیا اور جمود طاری ہو گیا، خانقاہیں ویران ہو گئیں اور ان سے پھوٹنے والی محبت کے سوتے خشک ہو گئے۔ علامہ اقبال کا خیال ہے کہ اب تصوف کا اپنی اسی پرانی شکل میں احیاء ممکن نہیں رہا بلکہ وہ اس کے افکار میں نوفلاطونی، عجمی اور ہندی نظریات کی آمیزش کو تعلیمات اسلام کے منافی سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کا تو یہ بھی خیال ہے کہ تصوف کے بعض سلسلے جو اسلامی سمجھے

© rasailojaraid.com

جاتے ہیں درحقیقت مجوسی یعنی عجمی مذہبی واردات کا ہی چربہ ہیں:

"Indeed there is evidence to show that that certain schools Sufism now known as Islamic have only repeated the Magian type of religious experience."

ان کا کہنا ہے کہ قرون وسطی کے دور کی صوفیانہ تکنیک موجودہ دور میں کارآمد نہیں اس لئے وہ تصوّف میں اصلاح اور اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آج انسان تعلق باللہ کے سلسلے میں جس قسم کی نئی باطنی واردات کا متلاشی ہے اس کے لئے نوفلاطونی، تصوّف خواہ یہ اسلامی ہو یا عیسوی، محض بیکار ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

© rasailojaraid.co

"The quest after a nameless nothing — be it Christian or Muslim — cannot satisfy the modern mind which with its habits of concrete thinking demands a concrete living experience of God."

(ترجمہ) ___ تصوّف خواہ مسیحی ہو یا اسلامی، اس کی نوافلاطونی شاخ کو جس بے نام سی "لاشئے" کی جستجو ہے اس زمانے کے انسانوں کو اس کے اندر کوئی سامان تسکین نہیں ملتا۔ ہمارا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اگر خدا ہے تو ہمیں اس کی موجودگی کا سچ مچ حقیقی اور واقعی تجربہ ہو ___"

علامہ اقبال کے خیال میں عہد حاضر کے انسان کو جس قسم کے فکر کی عادت ہو گئی ہے اس کا تعلق اشیاء اور حوادث کی دنیا سے ہے اور یہ وہ عادت ہے جس کی اسلام نے اپنے تہذیبی نشو و نما کے ابتدائی ادوار میں حمایت کی تھی۔ چنانچہ وہ خدا کی موجودگی کا سچ مچ، حقیقی اور واقعی تجربہ (Concrete living experience) حاصل کرنے کے لئے دور حاضر کے انسان کی اسی ذہنی عادت (Concrete habits of thought) سے مدد لینا چاہتے ہیں۔ انہیں

© rasailojaraid.co